دارِ بنی ہاشم سے احاطۂ بنی ہاشم تک

محمد احمد حافظ

باور نہیں آتا کہ وہ جو خزاں رُت میں بھی بہاروں کے لب و لہجے میں بات کرتا تھا، یوں اچانک ہمیں چھوڑ کر چل دے گا۔ دماغ نے تو تسلیم کرلیا ہے، مگر دل کا کیا کیجیے کہ وہ ابھی تک مان کر نہیں دے رہا کہ بنی ہاشم کا وہ لعلِ جہاں تاب اس دارِفنا کو چھوڑ کر دارِ بقا کو سدھار گیا ہے۔ دنیا اُسے سید ذوالکفل بخاری کے نام سے جانتی تھی۔ والدین کا انتالیس سال کی عمر میں بھی ''مُنّا'' تھا۔ گھریلو ماحول میں اُسے ''مُنّے شاہ'' کے نام سے پکارا جاتا۔ ہمارے عزیز دوست اور بھائی عابد مسعود نے فون پر اُن کے انتقال کی اطلاع دی تو جانے کتنی دیر تک سکتے کی کیفیت رہی۔ بہت کوشش کی کہ ہمت پکڑ کے جناب سید کفیل بخاری صاحب سے تعزیت کروں، مگر ناکام رہا۔ اور جو کی بھی تو صدمے کی حالت میں الفاظ نے زبان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تعزیت تو تسلی دینے اور اللہ کی رضا میں راضی رہنے کے لیے کی جاتی ہے۔ اور یہاں کیفیت یہ کہ خود تسلی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

ظالم نے موت کا کس خوبصورتی سے استقبال کیا، بس یہ سن کر دل کو جیسے قرار آ گیا، حوصلہ مل گیا اور اُس کے وصول بحق ہونے کا یقین ہوگیا۔ سید ذوالکفل بخاری (اللہ اُن کی قبر پر کھربوں رحمتیں تا قیامت برسائے) پچھلے سات آٹھ سال سے بسلسلۂ تدریس سعودیہ میں مقیم تھے۔ پہلے پہل منطقۂ تبوک کے شہر املج میں قیام تھا اور وہاں ننھے مُنّے عربی بچوں کو انگریزی پڑھاتے رہے۔ قریباً ایک سال قبل ہی ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں اُن کا تقرر ہوا تھا۔ گزشتہ اتوار کی سہ پہر یونیورسٹی سے اپنی گاڑی میں واپس آ رہے تھے کہ مخالف سائیڈ سے آنے والی گاڑی نے زوردار ٹکر ماردی۔ اُن کی گاڑی قلابازیاں کھاتی ہوئی دور جا کر رکی۔ خوفناک حادثہ تھا، اور سوار کا بچ جانا ناممکن نظر آتا تھا۔ موقع پر موجود شُرطوں نے آخری لمحات کی جو تفصیل بتائی وہ حیران کن تو ہے ہی، ایمان افروز بھی ہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ گاڑی قلابازیاں کھا کر جوں ہی رکی، اللہ کے اِس بندے نے فوراً بآوازِ بلند کلمۂ شہادت پڑھا، انگشتِ شہادت آسمان کی طرف بلند کی اور یہ تب ہی ڈھلکی جب روح قفسِ عنصری کو چھوڑ کر بلندیوں اور رفعتوں کی طرف پرواز کرگئی۔ یہ بھی مرنے کی خوب صورت ادا ٹھہری!

ایامِ حج کی وجہ سے حجاج کا خوب رش تھا اور اِسی رش کی وجہ سے بعض اوقات تغسیل و تکفین میں دو تین دن تک کی تاخیر بھی ہوجاتی ہے۔ مگر اللہ پاک کا کرم ہوا کہ اگلے دن پیر کی صبح حرم میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی جس میں پوری دنیا سے آئے ہوئے لاکھوں حجاجِ کرام نے شرکت کی۔ یوں اُن کی نمازِ جنازہ میں دنیا کے ہر خطے کی نمائندگی ہوگئی۔ اور اللہ کا کرم بالائے کرم یہ ہوا کہ جنت المعلیٰ کے احاطۂ بنی ہاشم میں تدفین عمل میں آئی۔ یہاں بھی سید ذوالکفل بخاری کی خوش بختی کام آئی کہ جنت المعلیٰ کے اِس حصے میں تدفین پر پابندی ہے، مگر اُن کا نصیب کس قدر بلند تھا کہ اِس پابندی کے باوجود حضرت ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں جگہ مل گئی۔ یوں لعلِ بنی ہاشم دارِ بنی ہاشم سے طویل سفر کے بعد جنت المعلیٰ کے احاطۂ بنی ہاشم میں آسودۂ خاک ہوگیا۔ یہ سب کیسے ہوا؟ کیوں ہوا..... تو اِس کا ایک ہی جواب سمجھ میں آتا ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ خود وصول

کرنے والے ہوں، اُس کے لیے سعادت وخوش بختی کے دروازے یوں ہی کھلا کرتے ہیں۔

راقم اُن کے انتقال کی خبر سن کر بہت دیر تک یادوں کے محل میں کھویا رہا۔ ۱۹۹۱ء میں جب خیر المدارس میں بغرضِ تعلیم داخلہ لیا تو جمعہ کی جمعہ دارِ بنی ہاشم میں حاضری ہونے لگی۔ حضرت پیر جی عطاء المہیمن بخاری اور جناب سید کفیل بخاری صاحب سے پہلے سے شناسائی تھی، اِنہی ہفتہ واری ملاقاتوں میں ذوالکفل بخاری صاحب سے بھی شناسائی ہوگئی۔ پہلے قدرے تکلف رہا مگر ہم عمری نے یہ فاصلے پاٹ دیے۔ تب حضرت امیرِ شریعت رحمہ اللہ کے بڑے فرزندِ گرامی سید ابومعاویہ ابوذر بخاری رحمہ اللہ اور حضرت سید عطاء المحسن بخاری رحمہ اللہ حیات تھے۔ راقم کی کوشش ہوتی تھی مدرسے سے فرصت ہو تو اِن حضرات کی مجلسوں میں حاضری دی جائے۔ حقیقت ہے کہ یہ مجلسیں ''دارِ معاویہ'' کی ہوں یا ''دارِ بنی ہاشم'' کی، بہت یادگار ہوتی تھیں۔ علم، ادب، تحقیق، تاریخ، تنقید، سیاسیات، سماجیات، اخلاقیات، غرض کیا کچھ نہ ہوتا اِن مجلسوں میں۔ اب جس بندے کی آنکھ ہی اِس ماحول میں کھلی ہو وہ خود کیا کچھ نہ ہوگا۔ معروف معنوں میں دیکھا جائے تو ذوالکفل بخاری کوئی مستند مولوی نہ تھے، کالج یونیورسٹی میں پڑھا، آئندہ زندگی بھی اِسی سے وابستہ رہی۔ مگر آپ ذرا اُن کے قریب بیٹھیے اور ان کی ذات کی پرتیں کھولنے کی کوشش کیجیے تو ایک نیا جہان دریافت ہوگا۔ علم وادب کا کون سا موضوع تھا جس میں کبھی اُن کی طبیعت بند رہی ہو۔ اللہ پاک نے اُنھیں ذہانت وفطانت، نکتہ رسی اور معاملہ فہمی سے خوب نوازا تھا۔ بہت سے معاملات میں اُن کی رائے حرفِ آخر سمجھی جاتی۔ یوں اگر اُن کی شخصیت کا پورا خاکہ اور تانا بانا سمجھنا ہو تو آپ مشاہداتِ قادیان میں حضرت سید ابومعاویہ ابوذر بخاری رحمہ اللہ کے مقدمے کا خاص وہ حصہ پڑھ لیجیے جو اُن کی ذات سے متعلق ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> .....سید محمد ذوالکفل حسینی بخاری سلمہٗ الباری تمام بھائی بہنوں کے مقابلہ میں اپنی درویشانہ سادہ شکل وصورت اور باوجود بہ ظاہر بالکل غیر ذہانت آمیز وضع قطع کے ابتدائی چند سالہ زندگی کے سوا چشمِ بددور کم از کم میرے لیے تو بالکل اور اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے لیے بھی کافی حد تک غیر متوقع اور حیرت انگیز طور پر بے حد ذہین وفطین، بیدار دل ودماغ اور غور وفکر کی خوگر طبیعت کے ساتھ ہی بڑے ہی حوصلہ افزا اور مستقبل میں بہت سی علمی اور دینی ترقیات کے ضامن اندازِ تعلیم وتقریر وتحریر کے ساتھ اُبھرا ہے۔.....

حضرت نے اُن کے متعلق جن توقعات اور تمناؤں کا اظہار کیا تھا کچھ ایسا ہی خیال دوست احباب کا بھی تھا۔ اُنھوں نے جس تیزی کے ساتھ تعلیمی اور علمی مدارج طے کیے وہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ وہ ملتان ہی میں رہ کر اپنا کیریئر بنانا چاہتے تو کچھ ایسی رکاوٹ نہ تھی۔ تدریس کی لائن میں وہ بہت سے کہنہ مشق استادوں سے آگے تھے۔ لیکن وہ کس طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سعودی عرب کے ایک دورافتادہ شہر ''اُملج'' گئے، ایک عرصے تک وہاں چھوٹے بچوں کو انگریزی پڑھاتے رہے، پھر ایک سال قبل ہی ام القریٰ میں اُن کی تقرری ہوئی تھی، اِس سارے عمل کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے لاشعور میں کوئی بات ضرور کلک ہو رہی تھی کہ مکہ مکرمہ جلد پہنچنا ہے، کہ نصیبہ وہیں کا تھا۔

سید ذوالکفل بخاری مقرر، ادیب اور شاعر کی خوبیوں سے بھی متصف تھے۔ راقم کا ایک طرف جہاں برادرانہ اور دوستانہ تعلق تھا، وہیں استادی شاگردی کا تعلق بھی تھا۔ ''لکھنا پڑھنا'' اُنہی سے سیکھا۔ اِس ضمن میں جناب سید کفیل بخاری بھی میرے استاد ہیں، مگر ذوالکفل بخاری وہ تھے جنھیں بھائی جان بھی ''استاذ'' ہی کہتے۔ آپ اُن کی تحریروں کو اٹھا کر دیکھ لیجیے، موتیوں کی مالا معلوم ہوگی۔ الفاظ کی نشست وبرخاست، برموقع برمحل اور برجستہ..... گاہ گاہ راہ چلتے بے ضرر سی چٹکی بھی خوب مزا

دے جاتی۔ یہی تو خوبی ہوتی ہے تحریر کی۔ پھر چاشنی، رچاؤ، روانی...... اُنھوں نے بہت کم لکھا، لیکن جو لکھا اُس کا حق ادا کر دیا۔ شاید وہ اِس سلسلے میں مختار مسعود اور مشتاق احمد یوسفی کے مقلد تھے، کہ کم لکھو مگر لکھو تو اُس کا حق ادا کر دو۔ اُن کی بعض تحریریں بڑے معرکے کی ہیں۔ نقیبِ ختم نبوت میں زیادہ تر اُن کے کتابوں پر تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ یہ تبصرے ہی اِس پائے کے ہیں کہ اِنھیں علیحدہ مرتب ہونا چاہیے۔ اگر وہ اِسے تھوڑا مزید پھیلا لیتے اور اپنے قلم کو صرف اِسی سے وابستہ کر لیتے تو ''حضرتِ خامہ بگوش'' کو اپنے مرنے کی تسلی ضرور رہتی۔ اُن کی بعض بعض تحریریں بہت یادگار ہیں۔ حضرت سید ابو معاویہ ابوذر بخاری رحمہ اللہ کا انتقال ہوا تو ہمارے ایک بزرگ نے شاہ جی کا مسلک و مشرب اپنے تئیں متعین فرمانے کی کوشش کی۔ اِس کوشش میں ''دارِ معاویہ'' اور ''دارِ بنی ہاشم'' کو الگ الگ بلکہ ایک دوسرے کے مخالف خانوں میں دیکھنے کی تمنا زیادہ کارفرما تھی۔ اِس موقع پر ذوالکفل بخاری صاحب نے ''جانشینِ امیر شریعت کا مسلک'' (مطبوعہ نقیبِ ختم نبوت دسمبر ۱۹۹۵ء) کے عنوان سے مسکت جواب لکھا۔ اِسی طرح الطاف گوہر کی ایک گوہر افشانی کے جواب میں ''جبر کی سائنس سے صبر کی سائنس تک'' والا مضمون خاصے کی چیز ہے۔

اُن کی ابتدائی دور کی تحریریں بھی نہایت پختہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔ مثلاً مشاہداتِ قادیان میں ''داستان کہتے کہتے'' سید نبیل بخاری کے نام سے اور آتشِ ایران کا مقدمہ علامہ سید نقیب الحسینی کے نام سے...... یہ تحریریں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یاد ہے ایک مرتبہ ہمارے قیامِ ملتان کے زمانے میں شہدائے بالاکوٹ کا یومِ شہادت، قمری اور عیسوی تاریخیں اور دن تمام یکجا ہو رہے تھے۔ یہ خاص موقع واقعۂ بالاکوٹ کے بعد پہلی مرتبہ آ رہا تھا تقویم کے اعتبار سے۔ آئندہ نجانے کب آئے۔ بہرحال اُس دن ہم نے تحریکِ طلبۂ اسلام کی جانب سے تقریب کا اہتمام کیا اور راقم نے شہدائے بالاکوٹ خصوصاً امیر المؤمنین سید احمد شہید پر ایک مضمون بھی لکھا۔ مضمون لکھنے کو لکھ تو لیا، مگر تمہید کوئی ایسی جاندار نہ تھی۔ ذوالکفل بھائی کو توجہ دلائی تو اُنھوں نے تھوڑی ہی دیر میں ابتدائی دو پیراگراف لکھ دیے۔ اور یقین جانیے کہ مضمون میں جان پڑ گئی۔ حضرت سید عطاء المحسن بخاری نقیبِ ختمِ نبوت کے لیے گاہے بگاہے ایک رواں دواں کالم لکھ دیا کرتے تھے۔ راقم نے ایک مرتبہ اُن کا کالم صاف انداز میں لکھ کر خبریں میں بھجوا دیا۔ تب خبریں کا اسلوب قدرے جارحانہ ہوتا تھا۔ چناں چہ شاہ جی کا کالم ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور آئندہ بھی لکھتے رہنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا۔ اِس کے بعد کافی عرصے تک شاہ جی کے کالم ''دل کی بات'' کے نام سے خبریں میں چھپتے رہے۔

سید عطاء المحسن بخاری رحمہ اللہ کا اسلوب نہایت شستہ، رواں اور سلیس ہوتا تھا۔ وہاں آورد نہیں آمد ہوتی تھی۔ اور شاہ جی کو ہم نے کئی مرتبہ دیکھا کہ دارِ بنی ہاشم کے صحن میں لسوڑے کے نیچے چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ اچانک آمد ہوئی اور بآوازِ بلند کہا: ''یار! کاغذ قلم پکڑ کے لیائیں!'' اور اِس کے بعد دس بیس منٹ میں ایک پھڑ پھڑاتا کالم عدم سے وجود میں آ چکتا تھا۔ مگر بایں صورت کہ بہت سے الفاظ کے نقطے، شوشے، کومے اور فل اسٹاپ وغیرہ اشہبِ قلم کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے پاتے اور راستے میں ہی کہیں غائب ہو جاتے۔ اِس کالم کو بعد میں ''استاذ'' کے پاس ''آخری ٹچ'' دینے کے لیے بھیج دیا جاتا۔ استاذ کی ٹکسال میں ڈھل کر یہ کالم باہر آتا تو اِس کی آب ہی کچھ اور ہوتی۔ کاش کہ جناب سید کفیل شاہ صاحب تھوڑا کڑوا گھونٹ بھر کے اِن کالموں کا مجموعہ شائع کر دیں تو اردو کے ادبِ عالیہ میں ایک بہترین اضافہ ہوگا۔ یوں بھی اِن کا شائع ہونا ضروری ہے تا کہ اب جو ''اسلامی صحافیوں اور کالم نگاروں'' کی ایک نئی کھیپ تیار ہو رہی ہے اُسے اندازہ ہو کہ نظریاتی اور مزاحمتی کالم نگاری کا اسلوبِ نگارش کیا ہوتا ہے۔

پارسال ذوالکفل بخاری کی والدہ ماجدہ اور حضرت امیرِ شریعت رحمہ اللہ کی قابلِ فخر صاحبزادی کی کتاب سیدی و

اَبی منظرِ عام پر آئی تھی۔ واقفانِ حال جانتے ہیں کہ اِس کتاب کا کتنا انتظار کیا گیا۔ راقم کا جب بھی اِس سلسلے میں جناب کفیل شاہ صاحب سے رابطہ ہوتا تو فرماتے کہ مسودہ ذوالکفل کے پاس ہے۔ وہ اُس کی نوک پلک درست کررہے ہیں.....آئندہ سال آیا تو معلوم ہوا کہ بقول ذوالکفل کے، اِس میں مزید اضافوں اور تشریحی نوٹس کی ضرورت ہے.....سات آٹھ ماہ بعد پھر پوچھا تو جواب ملا کہ بس مقدمہ لکھنا رہ گیا ہے.....اگلے کئی ماہ بعد معلوم کیا تو پتہ چلا کہ کتاب تیار ہے، بس پریس جانے کی دیر ہے..... پھر کئی ماہ کے انتظار کے بعد پوچھا جناب! کیا اب اِس کتاب کے لیے پریس بھی نیا قائم کرنا ہوگا؟.....کہا نہیں۔ بس وہ ذوالکفل نے کچھ نئی باتیں بتائیں۔ اِس لیے خیال ہوا کہ اِنھیں بھی شامل کرلیا جائے۔ بالآخر وہ روزِ سعید بھی آپہنچا جب مارچ-اپریل ۲۰۰۸ء میں کتاب منظرِ عام پر آہی گئی۔ سیدی و اَبی صرف ایک سوانح نہیں، ایک عہد کی تاریخ ہے، اور وہ عہد امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں۔ یہ کتاب صرف ایک مضمون کی صورت ''تری حیات ہے قندیل، رہ دکھاتی ہے'' کے عنوان سے نقیبِ ختمِ نبوت کے اولین امیرِشریعت نمبر میں چھپی تھی تو لوگ آنسوؤں کی سوغات دیے بغیر نہیں پڑھ پائے۔ عظیم المرتبت باپ کی خدمت میں ایک پاکباز بیٹی کا سوز و گداز میں ڈوبا ہوا اسلوبِ نگارش اللہ کی عطا ہے۔

یادوں کے اِس محل میں گم ہوا ہوں تو کئی باتیں یاد آرہی ہیں۔ ایک زمانے میں ہمیں مشترکہ طور پر عملیات سیکھنے کا شوق بھی رہا۔ اِس مقصد کے لیے استاذِ محترم اور راقم الحروف لیاقت پور قاری ظہورالرحیم صاحب کے پاس متعدد مرتبہ حاضر ہوئے۔ لیکن بعد میں اُن کا رجحان تبدیل ہوگیا اور وہ حضرت خواجہ خان محمد صاحب دامت برکاتہم سے باقاعدہ بیعت ہوکر اوراد واشغال میں مصروف ہوگئے۔ تصوف تو اُن کے گھر کی سوغات ہے۔ اِس سے اُن کے خصوصی لگاؤ نے اُن کی شخصیت میں عجیب کشش اور رعنائی پیدا کردی تھی۔

ذوقِ سلیم کے مالک تھے، اور اللہ تعالیٰ کی عنایات بھی اُن پر پیہم رہیں، ورنہ آج کے دور میں کسی نوجوان کو ذہانت وفطانت اور بلند پایہ خاندانی نام ونسب مل جائے تو فتنہ گر بننے میں دیر نہیں لگتی۔ یوں اگر وہ اپنی کوئی الگ راہ نکالنا چاہتے تو کم از کم ''حلقۂ ذوالکفلیہ'' وجود میں آہی جاتا، مگر یہاں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اسلاف کے مسلک اور اعلیٰ خاندانی روایات کے ساتھ تمسک اُن کا وطیرہ تھا۔

سالِ گزشتہ اُن کی آمد ہوئی تو ملاقات کے لیے ملتان حاضر ہوا۔ دورانِ ملاقات بعض مسائل پر گفتگو کچھ تندی کا رخ اختیار کرگئی۔ راقم کو افسوس ہوا اور واپسی پر عتاب آمیز خط دونوں بھائیوں کو لکھ مارا۔ جانے مجھ سے ایسا کیوں سرزد ہوا۔ اب سوچتا ہوں تو بہت ندامت ہوتی ہے۔ اِس کے بعد خط کا جو جواب آیا، اُس نے مجھے شرم سے پانی پانی کردیا۔ میں نے کیا خیال کیا تھا، اور اُدھر کیا کیا محبتیں نچھاور ہورہی تھیں۔ وہ خط محفوظ ہے۔ اور میرے لیے تو اب بہت بیش قیمت ہوگیا ہے۔ کریم لوگوں کی یہی تو نشانیاں ہوتی ہیں جو لوگوں کو اُن کا بے پناہ گرویدہ کردیتی ہیں۔

ذوالکفل بخاری کیا تھے؟ میرے ایسا ہیچ مدان کیا نقشہ گری کرے گا۔ ہاں حافظ صفوان محمد قلم اُٹھائیں گے تو کچھ اندازہ ہو پائے گا، یا اُن کے دیگر اہلِ قلم دوست۔ بہرحال یہ کہنا تو بے جا ہوگا، اور تقدیر سے گلہ بھی، کہ اُن کی موت بے وقت ہوئی۔ کوئی موت بے وقت نہیں ہوتی۔ ہاں یہ حسرت ضرور رہے گی کہ وہ کچھ دن اور جی لیتے اور مہر ومحبت کے پیکر اِس انسان سے ہم لوگ مزید فیضیاب ہولیتے! اِتنی مختصر سی رفاقت پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ:

حیف! در چشمِ زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد